ایک ادبی خطبۂ صدارت

از مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی

یہ خطبۂ صدارت ۲۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دہلی میں ایک بزم مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے پڑھا گیا اس میں ایک "پیر دانا" کی زبان سے آج کل کے روز افزوں ذوق شعر گوئی اور عام مشاعرہ بازی سے متعلق جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں امید ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء ان پر غور فرمائیں گے۔ (برہان)

حضرات!

میں آپ کے ادبی ذوق و احساس کا معترف ہوں کہ آپ نے یہ ادبی جلسہ منعقد کر کے قرول باغ میں بعض شعراء کے اجتماع کا انتظام کیا، اور بغایت ممنون کہ مجھے اس جلسے کی صدارت عطا فرما کر معزز فرمایا۔ آپ کا یہ ادبی ذوق و احساس اس عالمگیر ذوق و احساس کی ایک کڑی ہے جو آج تمام ملک پر زندگی بن کر چھایا ہوا ہے۔ اس دورِ کرب و اضطراب میں جبکہ زندگی کے تصورات بھیانک۔ اور دنیا کے آثار خوفناک سے خوفناک تر ہوتے جارہے ہیں، ملک کی یہ ادبی بیداری ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اس بیداری کے اسباب پر غور کریں اور سوچیں کہ ہوائی جہازوں کے سائے میں، اقتصادی مشکلات کی دھوپ میں اور زندگی کی ناہموار موجوں میں ہم بساطِ ادب بچھانے اور علم و ادب کا جھنڈا لہرانے پر اس قدر حریص کیوں ہیں؟ یہ وقت یہ زمانہ اور یہ دور، معاشی جدوجہد، مدافعتی کوشش، خوراک کی پیدائش و فراہمی، تعمیر بعد تخریب کی تدبیروں میں شب و روز مصروف رہ کر زندگی کی دشواریوں میں آسانی پیدا کرنے کا ہے۔

یہ انقلابی اور عبوری عہدِ حیات، تن آسانی، غزلخوانی، اور نغمہ فشانی کا نہیں بلکہ مسلسل محنت مستقل تفکر اور خاموش گذاری کا ہے۔ پھر اس کا کیا سبب ہے کہ اس دورِ بیم و رجا میں ادبی مجالس اور شاعروں کی کثرت نسبتاً بڑھتی ہی چلی جارہی ہے اور تمام ہندوستان مجسمۂ شعر و نغمہ بن کر رہ گیا ہے۔

اس کا ایک بڑا سبب زوالِ قومیت ہے۔ جو قوم جس قدر زوال پذیر ہوتی ہے اس میں اتنے ہی شاعر زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ مسلمان اس وقت زوال میں ہیں اور انھیں اپنے عروج وکمال تک پہنچنے میں ابھی کئی صدیاں لگیں گی۔ شعرا کی یہ روز افزوں تخلیق اسی زوال و انحطاط کا سبب ہے ؎

بیکار مباش کچھ کیا کر ممکن ہو تو شعر ہی کہا کر

زمانۂ زوال کا احساس کم کرنے کے لئے ہر قوم اپنی تفریح اور وقت گذاری کے لئے کچھ ذریعے تلاش کرتی ہے۔ مسلمانوں کی تفریح کا مہذب ذریعہ آجکل صرف "مشاعرہ" ہے جس سے شعراء کی وقت گذاری اور سوسائیٹی کی دل لگی ہوتی رہتی ہے۔ سوسائٹی کی دل لگی، دلچسپی اور دلنوازی کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔ مثلاً تھیٹر، سنیما، نمائش وغیرہ لیکن تھیٹر اور سنیما میں کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور مشاعروں میں "جلوۂ مفت نظر" مل جاتا ہے۔ گو اب جنگی اور ملکی ضرورتوں نے مشاعروں پر بھی ٹیکس لگانا شروع کردیا ہے لیکن ابھی یہ ٹیکس عام نہیں ہے۔

تو گویا اس زمانہ زوال میں تھیٹر، سنیما، نمائش، دنگل، محفل رقص وسرود، اور مشاعرہ۔ ایک ہی جذبۂ تفریح کے چند مختلف عنوان ہیں۔ جن سے مقصود دل بہلانا، وقت گذارنا اور تھکے ہوئے دماغوں کو آرام دینا ہے۔

لیکن جب میں سوچتا ہوں کہ شاعری آج کل صرف ذریعۂ تفریح ہے تو مجھے واقعی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ "ادب برائے ادب" ہے۔ دوسری جماعت کا نقطۂ نظر ہے کہ "ادب برائے زندگی" ہونا چاہیئے۔ مگر مشاہدہ کہتا ہے کہ آج ادب نہ تو برائے ادب ہے نہ برائے زندگی، بلکہ صرف "ادب برائے تفریح" ہے۔ یہ کس قدر افسوسناک مشاہدہ ہے۔ جو قومیں اپنے ادب سے کھیل سکتی ہیں۔ جو قومیں علم وفن کو ذریعۂ تفریح بنا سکتی ہیں۔ جو قومیں ادبی مجالس سے تھیٹر اور سنیما کا کام لے سکتی ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ ان ناہموار، غلط، اور پیچیدہ راستوں سے وہ کبھی منزلِ عروج تک نہیں پہنچ سکتیں۔

قومیت کا زمانۂ زوال تدبّر اور تفکر میں بسر ہونا چاہیئے۔ غور وفکر میں گذرنا چاہیئے اور بجائے

شور وغل کے خاموشی ویکسوئی کے ساتھ غور کرتے ہیں صرف ہوتا ہے۔ نہ کہ ہنگامہ وغوغا اور شورش پراگندگی میں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زوالِ قومیت کا علاج صرف ملک کے رہنما ہی کر سکتے ہیں، عوام کو اس سے کچھ واسطہ نہیں میری رائے میں وہ غلطی پر ہیں۔ احساسِ زوال جب تک انفرادی طور پر قوم کے ہر فرد میں بیدار نہ ہو جائے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اس لئے قوم میں اجتماعی طور پر احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے ہمارے مشاعرے بھی ایک اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں لہذا انھیں بھی احساس بیداری کے کام میں لانا چاہیئے۔ لیکن کسقدر افسوسناک ہے یہ حقیقت کہ مشاعروں میں احساس بیدائی تو درکنار، افراد و عوام کے ہر گونہ احساس کو کچلنے یا دبا دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور صرف ایک جذبہ تفریح کو ابھارنے میں تمام قوتیں صرف کر دی جائیں ہیں۔

شاعر، عام پسند ایک غزل پڑھتا ہے۔ عوام وقتی طور پر اُسے سُن کر محظوظ ہوتے ہیں اور غزل کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری غزل پڑھے جاتے تک پہلی غزل کا ذرا سا بھی اثر، دل میں تو کہاں کانوں میں بھی باقی نہیں رہتا منفی و مثبت کا یہ سلسلہ ختمِ مشاعرہ تک جاری رہتا ہے اور ختم مشاعرہ کے بعد نتیجہ صفر نکلتا ہے۔ یہ ہے ہمارے مشاعروں کا مآل و مقصد، راتوں کو جاگ کر تندرستی خراب کرنا۔ اور پھر کسی حاصل تک نہ پہنچنا۔ دانستہ تضیع اوقات کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اس لاحاصلی۔ اس تضیع اور اس ہنگامی تفریح ناکام میں اس دور کے شعراء ہی قابلِ الزام نہیں ہیں بلکہ اس میں سب سے زیادہ ہاتھ سوسائٹی کا ہے۔ جو شاعر کو اپنی پست ذہنیت اور گرے ہوئے مذاق سے مسطح و متوازن دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر شاعر سوسائٹی کے مذاق سے متوازن اور سوسائٹی کا ہم آہنگ نہیں ہوگا تو اسے "داد" نہ دے کر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس کی ہم آہنگی پر مجبور ہو جائے، بیچارہ شاعر جس کی دماغی محنت کی قیمت "داد" کے سوا بازارِ سخن میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ مجبوراً سوسائٹی کے مذاق کی پذیرائی کرتا ہے اور اس طرح سوسائٹی غالب اور شاعر مغلوب رہتا ہے۔

اسی ہفتے عربک کالج دہلی کے ہال میں ایک مشاعرہ ہو چکا ہے اس کی دوسری نشستِ شبانہ میں

میں نے دیکھا اور سُنا کہ ایک پردہ نشین خاتون نے جنابِ صدر سے درخواست کی کہ وہ نظم پڑھوائی جائے، جس کا عنوان ہے "جمنا کے کنارے" شاعر نے یہ نظم پورے جوش وخروش اور بلند بانگی سے سنائی۔ اس نظم میں ایک ہندو دوشیزہ کے سراپا کی تصویر کھینچی گئی ہے جو جذباتی اعتبار سے اگر بالکل عریاں نہیں کہی جا سکتی تو قریب قریب عریاں ضرور تھی۔ نظم سن کر عربک کالج کا ہال گونج اٹھا اور ہر طرف سے داد وتحسین کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ یہ ہے آپ کی سوسائٹی کا مخلوط مذاق، جس میں عورتیں مرد جوان اور بوڑھے سب شریک ہیں۔ یہ نظم اس حال میں سنائی گئی جس کی دیواروں پر بہت سے شمس العلمار فضلا، رہنمایانِ قوم، شعرا، اور ادبا کی تصویریں آویزاں ہیں۔ یہ اپنی کھلی ہوئی مگر بے نور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور روحانی کانوں سے سن رہے تھے کہ عربک کالج ہال میں بیٹھنے والی پبلک کیا سُن رہی ہے میں دریافت کرتا ہوں کہ زعمائے قوم کی یہ تصویریں کیا صرف نمائشی ہیں، کیا انھیں صرف درودیوار کی زینت کے لئے آویزاں کیا گیا ہے؟ مجھے بتائیے ان کے تصورات اور ان کے اعمال وکردار "جمنا کے کنارے" مرتب ہوئے تھے یا مسجدوں کے صحن میں؟ کیا ان کی موجودگی میں بھی کسی شریف خاتون کو عربک کالج کے اس ہال میں ایسی نظم کی فرمائش کرنے کی کبھی جسارت ہوئی تھی؟ اگر نہیں تو ماضی وحال کا مقابلہ کرکے دورِ حال کے شاعر اور سامع کی ذہنیت کا اندازہ کیجئے۔ اور پھر ماتم!

"ببیں تفاوتِ ذوق از کجاست تا بہ کجا"

یہ غالبیت ومغلوبیت برابر اور مسلسل چلی جاتی ہے۔ اور ہم ہر مشاعرے میں اسے محسوس کرتے ہیں مگر ہمارا خیال کبھی ادھر نہیں جاتا کہ ہم سوسائٹی کی اصلاح کرکے ادب کو زندگی کے اہم واقعات کا آئینہ دار بنائیں اور قوم کے تفریحی وجذباتی عناصر کو بیکار کرکے ان میں تعمیری، اصلاحی زندگی کا نیا اور کارآمد خون پیدا کر دیں جو تخریب کے جراثیم سے قطعاً پاک ہو۔

شاعر اپنے زمانہ کا معنوی استاد اور پیغمبر ہوتا ہے۔ اس سے ملکوں اور اقلیموں نیز قوموں کی تعمیر و اصلاح کا کام وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق ہر ملک میں ہوتی ہے۔ لیکن شاید آپ حضرات کو معلوم نہ ہو کہ ہر ملک کی شاعری نے اپنے رجحانات اور مقاصد تبدیل کر لئے ہیں۔ اردو شاعری

فارسی شاعری کی مقلد ہے۔ مگر فارسی شاعری نے بھی ایران میں نیا جنم لے لیا ہے۔ اب وہاں قومیات و سیاسیات پر علی العموم فکر فرمائی ہوتی ہے اور جذباتی شاعری کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ یہی حال ترکستان اور دوسرے ممالک میں بھی ہے لیکن ہندوستان ابھی تک اسی تقلید و نقالی کے غلط دوراہے میں پڑا ہوا اردو شاعری کی قدامت کا ترجمان و علم بردار ہے۔ اور صرف سوسائٹی اس کی اس قدامت پسندی کی ذمہ دار ہے۔

تو کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا؟ کیا ہم اپنی ادبی مجالس کو اس ارتفاعی اور ارتقائی منزل تک نہیں پہنچا سکتے جہاں تخریب و تضیع کی ہوا بھی نہیں پہنچ سکتی۔

میرے خیال میں اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ مشاعروں کو کسی طرح عوام سے محفوظ کر لیا جائے یعنی ایسا انتظام کیا جائے کہ سوائے اہلِ علم اور سخن فہم افراد کے جاہل اور بدمذاق عوام ہمارے مشاعروں میں کسی طرح شریک نہ ہوں۔ عوام کے لئے ہمارے مشاعروں اور ادبی مجالس میں دور و نزدیک اوپر نیچے، کہیں بھی جگہ نہ ہو۔ جب ہمارے مشاعروں میں بدذوق و کم سواد مخلوق شریک نہ ہوگی اور صرف تعلیم یافتہ اور علم دوست حضرات شرکت فرمائیں گے تو یقیناً ہمارے شعرا اس نئی علمی و ادبی سوسائٹی کو اپنا ہم آہنگ بنانے کے لئے اپنا نصب العین شاعری بھی بدل دیں گے۔ کوئی تعلیم یافتہ ترقی پسند اور فضاشناس انسان، یہ کبھی پسند نہ کریگا کہ اس کے کانوں میں جذباتی، معاملاتی، رکیک اور گندہ اشعار ٹھونسے جائیں۔ وہ ہمیشہ اس قسم کے اشعار سے نفرت کریگا جن کا مقصد جنسی ہیجان پیدا کرنا ہو۔ اور جو سننے والوں کو بیداری کے بجائے سو جانے اور مر جانے کا پیام دیتے ہوں۔ تفریحی جذبات کی بیداری اور تعمیری افکار کی گراں خوابی یقیناً ایک زوال پذیر قوم کی موت ہے۔ قوم کی زندگی عبارت ہے احساسات و عزائم کی زندگی سے جب تعمیری احساسات زندہ ہوں گے تو قوم خود بخود زندہ ہو جائے گی۔ شاعر کا کام قوموں کو سلانا نہیں بلکہ جگانا ہے۔ لیکن جو قوم اپنے ساتھ اپنے شعرا کو بھی دعوتِ خواب دے۔ کیا اس قوم کے اس طرزِ عمل کو مستحسن کہا جا سکتا ہے؟ میری رائے میں آپ میں سے کوئی اس کی تائید نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر موجودہ دورِ زوال میں قوم کے تفریحی امکان کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں تو کیا ہماری قوم افکار و تردداتِ سے پریشان ہو کر پاگل نہ ہو جائیگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شاعری، کتنی ہی متین اور سنجیدہ کیوں نہ ہو؟ اگر اس میں موسیقی، محاکات ترتیبِ الفاظ، فصاحت۔ حسنِ بندش اور تخئیل کی خوشگواری موجود ہو تو اعلیٰ اور سنجیدہ طبقوں کے لئے وہ بھی سببِ تفریح ہو سکتی ہے۔ تفریح صرف ضنی جذبات کے ابھرنے ہی سے نہیں ہوتی۔ دماغی اور ذہنی بیداری و شگفت سے بھی ہوتی ہے۔ ہم جہاں صرف معاملہ بند شعرا کے کلام سے محظوظ ہوتے ہیں، وہاں غالب و اقبال کا متین، بلند اور فلسفیانہ کلام بھی ہمیں محظوظ اور مسرور کرتا ہے۔ یہی اہتزاز کافی ہے۔ اتنی ہی تفریح بہت ہے۔ اور اس کے آگے لغویت۔ میں نے جو علاج بتایا ہے اُسے آزما کر دیکھئے انشاء اللہ سو فیصدی کامیاب ہوگا۔

فی الحقیقت مشاعرے عوام کے لئے نہیں ہیں۔ عوام کے لئے (جن سے میری مراد جہلا ہیں) تھیٹر اور سنیما تفریح کے لئے کافی ہیں۔ مشاعرے صرف خواص تک محدود ہونے چاہئیں۔ اور عوام کے لئے قدغن ہونا چاہئے کہ وہ ہماری علمی و ادبی مجالس میں بالکل شریک نہ ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ قدغن سوسائٹی کے لئے ایک سبق اور تازیانہ ہو۔ اور سوسائٹی ہماری ادبی مجالس میں شریک ہونے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح گویا ہم اس کی تحدید یا توہین کرکے اس کی ترقی و بیداری کے لئے ایک صحیح راستہ کھول دیں گے۔ اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا کہ یہی پست سوسائٹی جو آج ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ذہنی و دماغی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہو کر پھر ہم سے آملے گی اور ہم اس وقت اپنی کوششوں کا حاصل "عام بیداری" کی صورت میں دیکھکر واقعی ایک حقیقی مسرت حاصل کر سکیں گے۔

حضرات! میں جانتا ہوں سوسائٹی کا غلبہ اتنا قوی ہو چکا ہے کہ میری کمزور آواز اس کی اصلاح نہیں کر سکتی لیکن میں اپنی ہی آواز بار بار بلند کروں گا۔ سوسائٹی اور شعراء کی پُر جمود رگِ حمیت کو بار بار جھنجوڑوں گا اور اس وقت تک جھنجوڑتا رہوں گا جب تک کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو جائے۔

میں اس علمی و تعلیمی دور کے فرزندانِ ملک سے مایوس نہیں ہوں۔ اگر آج کی ادبی صحبت میں

کوئی ایک شخص بھی میرا ہمنوا ہو کر مشاعروں کی تجدید و تہذیب پر آمادہ ہوگیا تو میں اسی کو اس خطبے کا حاصل و مآل سمجھوں گا۔ ہر تحریک کے لئے عمل اور ہر عمل کے لئے نمونے کی ضرورت ہے جب تک ہم ایسے مثالی مشاعرے قائم نہ کریں گے ہمیں اس تحریک کی افادیت کا یقین نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک مشاعرہ ایسا قائم کیجئے جس میں سب تعلیم یافتہ اور صاحبِ ذوق سامعین شریک ہوں۔ ہندوستان میں ہر جگہ اس کی تقلید و تائید رفتہ رفتہ ہونے لگے گی اور مشاعروں کا موجودہ غلط نظام آپ کو خود بخود ایک دن بدلا ہوا نظر آنے لگے گا۔

میں کئی راتوں کا جاگا ہوا ہوں۔ طبیعت مضمحل ہے۔ دماغ ماؤف ہے۔ اس لئے آج کی صحبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے علم دوست بزرگ میری اس گزارشِ مختصر کو شاعری نہ سمجھیں گے۔ اور شعر کی طرح سن کر بھول نہ جائیں گے۔ بلکہ اس تحریک کو عملی صورت دے کر میری ہم آہنگی و ہمنوائی فرمائیں گے۔

علامہ ابن الجوزی کی بلند پایہ کتاب

تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر

اتنے بڑے محدث کی ایسی مفید کتاب بالکل ناپید تھی صرف ریاست ٹونک میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ بڑی محنت کے بعد اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا اور اس طرح یہ قابلِ قدر کتاب وجود میں آئی۔ سیرت و تاریخ میں یہ اپنے رنگ کی عجیب و غریب کتاب ہے جس کی خصوصیتوں کا اندازہ مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے کتاب مختصر بھی ہے اور جامع بھی، اس میں بہت سی وہ باتیں مل جاتی ہیں جو سیرت و تاریخ کی بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں یا تو ملتی ہی نہیں، ملتی ہیں تو بڑی دشواری کے بعد۔

قیمت صرف پانچ روپئے آٹھ آنے

منیجر مکتبہ برہان دہلی۔ قرول باغ